اردو ناولوں میں نسائیت: آزادی سے قبل اردو ادب کا ایک سماجیاتی مطالعہ

پروفیسر عذرا عابدی،

صدر شعبۂ سماجیات،

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

تلخیص 1857 سے پہلے تک اردو ادب میں کہانیوں کا دور رہا۔ اردو کا یہ داستانوی ادب نسائیت (فیمینزم) کے اس تصور کو پیش کرتا ہے جو کسی نہ کسی طرح اس دور کی خواتین کی سماجی آواز کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کہانیوں میں صرف عورت کی منفی شبیہہ ہی نہیں بلکہ اس کے مثبت کردار کو بھی مصنفین نے بیان کیا ہے۔ کہیں یہ حقیقت کے قریب ہیں، تو کہیں تخیلاتی۔ یہاں تک کہ 1857 کے آتے ہی تخیل کی جگہ حقیقت نے لے لی اور کہانیوں کا دور ختم ہو گیا۔ سائنسی اور صنعتی دور میں کہانیاں ایک بھولی بسری یاد بن کر رہ گئیں، اور ناول اور جدید کہانی نے اردو ادب میں اپنی جگہ بنانا شروع کر دی۔

پیش کردہ مضمون میں آزادی سے قبل اردو ناول میں نسائیت کے موضوع کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اس ضمن میں کچھ اہم مصنفین جیسے نذیر احمد، سرشار، ہادی روسوا اور پریم چند کی نمایاں تخلیقات کے ذریعے بھارتی سماج میں نسائیت کا سماجیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ: نسائی، سماجی حقیق، اردو ناول، خواتین کی نمائندگی، سماجی تشکیل، پدر شاہی

تعارف اگرچہ کہانیاں اور قصے اپنی ادبی حیثیت سے خامیوں سے پاک نہیں رہے، لیکن سماج میں ان کی اہمیت اور خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا، اور نہ ہی مفکرین اور مصنفین اس سے منہ موڑ سکتے ہیں۔ قدیم زمانے سے ہی بھارتی سماج میں کہانیاں سنانے اور سننے کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کہانی سنانے کی مہارت انسان کی قدیم ترین فنون میں سے ایک ہے جو سماج میں رائج رہی ہے۔ یہ فن تقریباً ہر سماج، برادری اور ملک میں رائج رہا ہے۔ اردو میں اس فن کی پیدائش دیگر ادبی فنون کی طرح ایران میں ہوئی۔

1857 سے پہلے تک اردو ادب میں کہانیوں کا دور رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ادب کو بادشاہوں اور راجاؤں کے درباروں میں پناہ لینی پڑتی تھی، اور ان کی خواہش کے مطابق کہانیاں اور داستانیں لکھی جاتی تھیں۔ اسی سلسلے میں سب سے پہلی کہانی "سب رس" سن 1635 میں لکھی گئی اور عوام کے سامنے پیش کی گئی۔ اس کے مصنف اسد اللہ وجہی تھے۔ یہ کتاب اردو زبان میں ادبی لحاظ سے لکھی گئی پہلی تخلیق مانی جاتی ہے۔ اس سے پہلے جو مواد دستیاب ہے

وہ زیادہ تر مذہبی نوعیت کا ہے،اور اس میں وہ ادبی خوبیاں موجود نہیں تھیں۔ لیکن "سب رس " میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو کسی تحریر کو ادب کے زمرے میں شامل کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔

اگرچہ اسد اللہ وجہی کا مقصد اپنے دور کی سماجی یا اخلاقی تصویر کشی کرنا نہیں تھا، لیکن "سب رس " میں ایک ایسی دنیا سامنے آتی ہے جو صرف خیالی نہیں بلکہ حقیقت سے قریب تر بھی ہے۔ ہر سماج میں عورت اور مرد کے تعلقات کو تسلیم کیا جاتا ہے، اور یہ تعلقات مختلف نوعیت کے اور مختلف صورتوں میں پائے جاتے ہیں۔ "سب رس " میں مردوں کی تصویر کشی کرتے ہوئے مصنف نے ان میں صبر اور برداشت کو خاص اہمیت دی ہے۔ بھارتی معاشرہ مردانہ غلبے والا رہا ہے، لیکن اپنی اس تخلیق میں وجہی نے عورتوں کی خوبیوں کا بھی ذکر کیا ہے، خاص طور پر ان عورتوں کا جو اپنے شوہروں کو دیوتا مانتی ہیں اور ان کے ساتھ وفادار رہتی ہیں۔

جس وقت "سب رس " لکھی گئی، اُس وقت سماج میں کثرتِ ازواج کا رواج عام تھا اور سوکنوں کے جھگڑے ہر گھر کی کہانی تھے۔ یہ حقیقت صرف کہانیوں میں ہی نہیں ملتی بلکہ اس وقت کے اردو ادب میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے، جو اس دور کے سماج کی اصل تصویر پیش کرتا ہے۔ اُس وقت عورتوں کو کم عقل تصور کیا جاتا تھا، اور اس کی وجہ ان میں پائی جانے والی نرمی اور حساسیت کو مانا جاتا تھا۔ مردوں کا یہ ماننا تھا کہ عورتیں جذبات کی رو میں بہہ کر غلط فیصلے کر بیٹھتی ہیں۔

اس کی مثال "سب رس " کی ایک کردار راجکماری حسن ہے، جو حسد کی وجہ سے بغیر سوچے سمجھے اپنے محبوب کو قید کر لیتی ہے اور آخر میں اپنے فیصلے پر پچھتاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس اردو کہانی میں ایسی عورتوں کا ذکر بھی ہے جو فریب اور مکر سے بھری ہوتی ہیں، اور ایسی عورت کو خدا کا گناہ سمجھا گیا ہے، جو دوسروں کے گھر تباہ کرتی ہے۔ ایسا ہی ایک کردار "سب رس " میں "غیر " نامی عورت کا ہے۔

اس طرح اردو کا یہ داستانوی ادب نسائیت کے اُس تصور کو پیش کرتا ہے جو کسی نہ کسی صورت میں اُس دور کی عورتوں کی سماجی آواز کو بیان کرتا ہے۔

جنوبی بھارت میں کہانیوں کا سلسلہ اٹھارھویں صدی کے آخر سے شروع ہوتا ہے۔ جب انیسویں صدی میں فورٹ ولیم کالج کے زیر نگرانی پندرہ کہانیوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ 1800 سے 1820 تک فورٹ ولیم کالج کے باہر لکھی جانے والی کہانیوں کی تعداد پانچ تھی جن میں "انشاءاللہ خان" کی "رانی کیتکی" کو خاص مقام حاصل ہے۔ ان کہانیوں میں بھارتی عورت کے وہ تمام رنگ موجود ہیں، جن کی تخلیق میں صدیوں کی روایات اور رسموں کا اثر پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بیٹیوں کے پیدا ہونے پر غم کا ماحول، شوہر کو خدا سمجھنا، عورت کا وجود صرف شوہر، بچوں اور گھر کے لیے، سکونت سے بھرپور گھر کا ماحول جس کے لیے ہمیشہ عورت قربانی دیتی ہے وغیرہ۔ اس وقت کی کہانیوں میں عورت کی تصویر اس کی خوبصورتی اور محبوب و محبوبہ کے قصوں، محبت کی ملاقاتوں اور ملاقات کے طریقوں کو دلچسپ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ تمام قصے کہیں نہ کہیں سماج کی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں۔ انہی کہانیوں میں مصنفین نے عورت کو رسم و رواج، مذہب اور قوم کے محافظ کے طور پر بھی دکھایا ہے جو تیز تلوں اور طنز کے ذریعے جنگوں کی صورتحال بھی بدل دیتی ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ کہانیوں میں صرف عورت کی منفی تصویر ہی نہیں بلکہ اس کے مثبت کردار کو بھی مصنفین نے بیان کیا ہے۔ کہیں یہ حقیقت کے قریب ہے تو کہیں خیالاتی ہے۔ یہاں تک کہ 1857 کے آتے ہی خیالاتیت کی جگہ حقیقت نے لے لی اور کہانیوں کا دور ختم ہو گیا۔ سائنسی

اور صنعتی دور میں کہانیاں ایک بھولی بسری کہانی بن کر رہ گئیں۔ ناول نے اپنی جگہ بنانا شروع کر دی۔ راجکماری کی جگہ نذیر احمد کی "اسغری" اور "اکبری" نے لے لی۔

پیش کردہ مضمون میں آزادی سے پہلے اردو ناول میں نسائیت کے موضوع کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اس ضمن میں میں کچھ اہم مصنفین جیسے نذیر احمد، سرشار، ہادی روسوا اور پریم چند کی اہم تخلیقات کے ذریعے بھارتی سماج میں نسائیت کا سماجیاتی مطالعہ پیش کروں گی۔ یہ بھی ایک خوبصورت اتفاق ہے کہ شاعری کی طرح ناول بھی دہلی اور لکھنؤ سے متعلق رہا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کو یہ کریڈٹ دیا جاتا ہے کہ آپ نے اردو میں پہلی بار ایسی تخلیق پیش کی جسے ناول کی درجہ بندی میں رکھا جا سکتا ہے۔ ان کے ناولوں، "مراتُ العروس، توبۃ النصوح، فسانۂ مبتلا، ابنُ الا وقت" وغیرہ میں سے کوئی بھی ایسا ناول نہیں ہے، جس میں انیسویں صدی کے سماجی زندگی اور اُس وقت کے مسلم گھرانوں کی حقیقتی تصویر پیش نہ کی گئی ہو۔ متوسط طبقے کے خاندانوں کی حالت زار اور ان کی اصلاحات کے ساتھ ساتھ عورتوں سے جڑی تباہی کا تفصیلی عکس نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں پیش کیا۔ نذیر احمد کے ناولوں میں متوسط طبقے کی خواتین کے سماجی اصلاحات اور فلاح کا ذکر بھی نمایاں طور پر کیا گیا ہے کیونکہ نذیر احمد کے مطابق کسی بھی سماج کی تشکیل اس کی خواتین کو اہمیت دیے بغیر نامکمل ہو گی۔ اپنے ناول "مراتُ العروس "میں لکھا ہے، "گھر کا کاروبار ایک دن بھی عورت کے بغیر نہیں چل سکتا، مرد جتنا بھی ہوشیار کیوں نہ ہو، ممکن نہیں کہ عورت کی مدد کے بغیر گھر چلا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کی موت کو ایک گھر کے اجڑنے سے جوڑا جاتا ہے۔"

نذیر احمد کا یہ نظریہ تھا کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی حالت میں زیادہ بہتری کی ضرورت ہے۔ جاگیر دارانہ نظام میں خواتین ایک تصویر کی مانند نظر آتی تھیں اور مرد انہیں اپنی سرمایہ سمجھتے تھے۔ ان کے ناول میں عورتوں کی خراب اور بدتر حالت کے تمام پہلو واضح طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ انہی وجوہات کی بنا پر عورتوں کی شخصیت نہ تو مکمل طور پر ترقی کر سکی اور نہ ہی وہ اچھی بیوی یا اچھی ماں بن سکیں۔ نذیر احمد اپنے ناول میں عورتوں کی حالت کے لیے کہیں نہ کہیں مردانہ معاشرے کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مردوں نے عورتوں کو اپنے ذاتی مفادات کے لیے استعمال کیا اور اپنے زیرِ نگی رکھا جس کے نتیجے میں خواتین تعلیم اور معاشرتی روایات سے محروم ہو گئیں۔ اس کا سبب مردوں میں یہ خوف تھا کہ کہیں عورتیں تعلیم یافتہ ہونے کے بعد اپنے حقوق اور فرائض کا مطالبہ نہ کرنے لگیں اور مردوں کے برابر معاشرہ میں جگہ نہ بنالیں۔

اس پابندی کا منفی اثر عورتوں کی شخصیت پر پڑا اور آہستہ آہستہ معاشرے میں ان کا زوال شروع ہوا اور وہ خود بھی معاشرے میں پھیلائے گئے اس اسودہ رسم ورواج کو اپنانے لگیں۔ اس طرح جہالت، روایات اور ریتی رواج نے عورتوں کو مکمل طور پر جکڑ لیا اور وہ انہیں اپنے قبضے میں رکھنے میں کامیاب رہے۔ نذیر احمد نے اس مسئلے کو بھی اپنی تخلیق میں جگہ دی ہے۔ وہ عورتوں کے اس زوال اور اپنے گھریلو فرائض سے گریز کے نتائج کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب عورتیں اپنے گھر خاندان، شوہر، بچوں اور رشتہ داروں کے فرائض کو بخوبی نبھانے میں ناکام رہیں تو ان کے شوہروں نے اپنے دل کو بہلانے اور عیاشی کے لیے طوائفوں کے پاس جانے لگے۔ یہ طوائفیں ان کے لیے ایسے تمام مواقع اور وسائل فراہم کرنے لگیں جو اُس وقت

کے متوسط طبقاتی خاندانوں میں مردوں کے لیے دستیاب نہیں تھے۔ نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں مکمل طور پر ایسے مواقع کے لیے عورتوں کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

نذیر احمد عورتوں میں کچھ مخصوص خصوصیات دیکھنے کی بات کرتے ہیں جن سے گھر کا ماحول خوشگوار رہے اور شوہر مطمئن رہیں، اور اس ضمن میں وہ تعلیم کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ تعلیم کا مقصد عورت کو ایک اچھی بیٹی، بیوی اور ماں بنانا ہونا چاہیے۔ نذیر احمد کی نظر میں عورتوں کی تعلیم کا تصور بہت محدود دکھائی دیتا ہے۔ اپنے ناول "مرات العروس" میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں، "عورت کا پیدا ہونا صرف مرد کی خوشی کے لیے ہے اور عورت کا یہ فرض ہے کہ وہ مرد کو خوش رکھے۔ افسوس کہ دنیا میں بہت کم عورتیں اس فرض کو پورا کرتی ہیں۔"

نذیر احمد کا یہ ماننا تھا کہ بیوی کی زندگی کا مقصد شوہر کی خدمت کرنا ہے۔ ان کے ناول میں جس مثالی عورت کی تصویر اُبھرتی ہے وہ حقیقت میں درمیانی طبقے کے مسلمان خاندانوں کی خواتین ہیں۔ یہ خواتین معاشی لحاظ سے مردوں پر منحصر تھیں اور اپنی زندگی صرف انہی کی خواہشات کے مطابق گزارتیں تھیں۔ معاشرے میں نہ تو ان کی کوئی عزت تھی اور نہ ہی کوئی وجود۔ یہ اُس وقت کی وہ حقیقی معاشرتی حالت تھی جس میں مذہب اور جاگیرداری نظام نے خواتین کے وجود کو مکمل طور پر دبا دیا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ چاہ کر بھی نذیر احمد کوشش کرنے کے بعد بھی اُس وقت کے رواج سے خود کو الگ نہ کر سکے، اور اپنی تحریر میں مرد پر مبنی معاشرے میں خواتین کے وجود کو اُسی نظر سے دیکھا جو اُس وقت کی نظامت اور سوچ چاہتی تھی۔

سرشار کا موضوع اودھ کی تہذیب اور ثقافت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے انفرادی اور معاشرتی دونوں پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ ان کا تعلق لکھنؤ سے تھا اور وہ شہر کی تنگ گلیوں سے لے کر محلے تک واقف تھے۔ انہی گلیوں اور محلوں میں گھوم پھر کر انہوں نے اپنا ادبی مشاہدہ کیا تھا۔ ان کے ناول میں خواتین میں بیگموں کی زندگی سے کہیں زیادہ دلچسپ اور جاندار تصویر اُس حصے میں دکھائی دیتی ہے جو مردوں کی تھی۔ یہ مرد نواب تھے، دولت اور لذت کے وہ تمام حقوق ان کے پاس تھے جن کی وجہ سے بیگموں کو محروم رکھا گیا تھا۔ اودھ کی تہذیب اور ثقافت سرشار کے ناولوں کا ایک اہم جزو ہے لہٰذا نوابوں کی پٹرانیاں ان کی محافظت بن کر اُبھرتی ہیں۔ وہ اپنی زبان، لباس اور برتاؤ میں ایسا کوئی عمل نہیں کرتے کہ انہیں غیر مہذب کہا جائے۔ یہ تمام خواتین چار دیواری کی پابند تھیں اور رسم و رواج کے بندھن میں جکڑی رہ کر انہیں بہت کم سیر اور تفریح کے مواقع مل پاتے تھے۔

سرشار نے اپنے ناولوں میں اودھ کی بیگمات کی تصویر پیش کرتے وقت ان میں وفاداری، رکھ رکھاؤ، شرافت، عزت اور قربانی جیسے اوصاف کو خاص مقام دیا۔ اس کی مثال 1860 میں شائع ہونے والے ناول "سیر کوہسار" کے کردار نواب نادر جہاں بیگم اور جامے سرشار کے نواب امین الدین کی بیوی ہیں۔ ۔ یہ خواتین نوابوں کے پست کردار کے مقابلے میں اعلیٰ اخلاقیات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ تاہم، اودھ کی ان اعلیٰ طبقاتی خواتین کی حالت صرف ان کے گھریلو ماحول اور شوہر کی خواہشات کی تکمیل تک محدود ہے۔ یہ خدمت گزارانہ رویہ ان کی زندگی کا مرکزی جزو ہے۔ اس کے عوض انہیں قیمتی لباس اور زیورات مل جاتے تھے اور ان کی زندگی کا زیادہ تر وقت سجاوٹی آرائش میں گزرتا تھا، جس میں وہ خوش نظر آتی تھیں۔

سرشار نے اپنے ناول میں مغلانی یعنی رکھیل یا لونڈی کی موجودگی کو بھی بیان کیا ہے۔ ایک خوبصورت اور پتیودار پٹرانہ ہونے کے باوجود نوابوں کا اس قسم کی بازار کی عورتوں سے تعلق اُس وقت کی خواتین کی سماجی حالت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ خواتین گھر کی چار دیواری میں بند رہتی

تھیں، تعلیم سے دور رہتی تھیں اور اپنے حقوق کا علم نہیں رکھتیں۔ آؤدھ کے بیشتر گھروں میں یہ مغلانی عورتیں اثرانداز ہوتی تھیں، جو بچوں کی پرورش کے لیے رکھی جاتی تھیں۔ تاہم، آہستہ آہستہ ان کا اثر اتنا بڑھ گیا کہ وہ پرورش کے علاوہ دوسرے کاموں میں بھی اپنا کردار ادا کرنے لگیں۔ سرشار نے اپنے ناول میں ان عورتوں کو "تریا کردار والی" قرار دیا ہے جو ہنستے کھیلتے گھر کو تباہ کرنے کا سبب بنتی تھیں۔

سرشار کی مثالی عورت جو بیگم تھیں، پردے میں پوشیدہ رہتی ہیں اور یہ پاکیزگی کی مثال بھی ہیں۔ سرشار بھی نذیر احمد کی طرح خواتین کی تعلیم کا مقصد صرف گھریلو تربیت سمجھتے ہیں تاکہ وہ اچھی بیوی اور اچھی ماں بن سکیں۔ ان کے ناول میں مثالی عورت ایک ایسی ناری ہے جو پرانی تہذیب اور ثقافت کی محافظ ہے۔ سرشار خواتین کی تعلیم کو ایک محدود نظریے سے دیکھتے ہیں۔

ہادی روسوا (1858-1931) کے ناولوں میں پہلی بار ایک فنکارانہ پہلو کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ ان کی تحریر میں سماجی ماحول اور اخلاقیات کے موضوع مرد اور خواتین دونوں سے متعلق ہیں۔ ہادی روسوا نے سماج کی تعمیر اور بربادی کے لیے خواتین کے فرائض سے انکار نہیں کیا۔ روسوا نے اپنے ناول میں نچلے طبقے کی ان خواتین کا بھی تذکرہ کیا ہے جو غربت اور جہالت کی وجہ سے اخلاقیات سے محروم ہو چکی تھیں اور وہ سماج کو تباہی کے علاوہ کچھ نہیں دے سکتیں تھیں، ان خواتین کا بنیادی مقصد لذت میں مگن نوابوں کو بے وقوف بنا کر ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی دولت چھیننا تھا۔ ہادی روسوا کے ناول میں کچھ کردار، جیسے کہ اختری بیگم، اختری شہزادی میں اور بوا حسینی اس کا بہترین نمونہ ہیں۔

لکھنؤ کے سماجی زوال کی کہانی خواتین مزدوروں یا طوائف کی بحث کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ ہادی روسوا نے اپنے ناول میں سماج اور طوائف کے باہمی تعلقات کا جائزہ لیا ہے۔ عمراؤ جان ادا میں خانم کا چکلا ایک ایسا واقعہ ہے جس میں اودھ کے سماجی ماحول اور اُس وقت کے اخلاقی اصولوں کی کھوکھلائی نمایاں ہوتی ہے۔ ایک طرف روسوا نے ان چکلاک پیدا ہونے کی وجوہات کو اجاگر کیا اور دوسری طرف یہ بھی دکھایا کہ لکھنؤ کی یہ طوائفیں نہ صرف نوابوں اور عیاش رئیسوں کو اپنی ادا سے لبھاتی تھیں بلکہ خود کو مذہبی قرار دینے والے مرد طبقے کو بھی اپنی خوبصورتی اور دلکشی کے انداز سے بچا نہ سکیں۔ روسوا کی ہمدردی عمراؤ جان اور خورشید جیسی طوائفوں کے ساتھ ہے، جو حالات کی مار کھا کر اس پیشے میں دھکیل دی گئی تھیں۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہادی روسوا نے اپنے ناول میں اودھ کے زوال کے بعد درمیانی طبقے کے خاندانوں کی خواتین میں پیدا ہونے والے بُروپنے کو بھی پیش کیا۔ روسوا ان عورتوں کے سدھار کے لیے تعلیم کو ناگزیر سمجھتے ہیں۔ ہادی روسوا کے ناول میں ایک امید کی کرن بھی نظر آتی ہے جو کہ تعلیم ہے، کیونکہ مصنف کا یہ ماننا ہے کہ اسی سے خواتین میں حالات کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا ہوگا۔

پریم چند کا دور ہندوستانی سیاست میں بیداری کا زمانہ تھا۔ اس وقت معاشرے میں انسانیت پسندی، تعلیم کے لیے کوششیں، اور آریہ سماج و برہمو سماج جیسے اصلاحی تحریکیں ابھر رہی تھیں، جن کا اثر پریم چند کی تحریروں پر بھی پڑا۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں بیوہ کی حالت، جہیز کی رسم، بے جوڑ شادیوں، اور خواتین کے احترام و بااختیاری جیسے سماجی مسائل کو موضوع بنایا۔ پریم چند نے دیہی ہندوستانی پس منظر کو بنیاد بنا کر خواتین کی برابری اور حقوق پر لکھا، لیکن ان کی حدود ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے دائرے میں تھیں۔

پریم چند خواتین کی اقتصادی خود مختاری کے حامی تھے، لیکن وہ اس کے مخالف تھے کہ خواتین کو اپنے وقار یا جسم کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑے۔ انہوں نے اس رجحان کی تنقید کی جہاں خواتین کو صرف سرمایہ دارانہ معاشرے میں ایک 'شے' سمجھا جاتا ہے۔ پریم چند خواتین میں بیداری پیدا کرنے کے لیے تعلیم کو بنیاد مانتے تھے، لیکن وہ مغربی تعلیم کے اثر سے ہندوستانی خواتین کو بچانا بھی چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مغربی تعلیم کے زیر اثر جو ثقافت خواتین اپنا رہی ہیں، وہ ان کے کردار کو بلند نہیں کر سکتی۔ ان کے مشہور ناول 'گودان' میں مس مالتی کا کردار اسی کا مظہر ہے۔

پریم چند کا ماننا تھا کہ ایک عورت کا وجود اس وقت مکمل ہوتا ہے جب وہ ایک اچھی ماں اور اچھی بیوی کہلاتی ہے۔ انہوں نے مردوں کے فطرت میں تھوڑا سا حیوانی پن پایا، جس پر قابو پانا مشکل ہوتا ہے، اور یہی حیوانی فطرت اسے مرد بناتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جس دن مرد اس سفر کو مکمل کر لے گا، وہ بھی عورت بن جائے گا۔ ہمدردی، قربانی، اور خدمت جیسے اوصاف دنیا کی ترتیب کے بنیادی ستون ہیں، اور یہ سب نسوانی خصوصیات ہیں۔ اگر عورت یہ سمجھ لے تو دونوں کی زندگی خوشحال ہو جائے گی۔ جب عورت مرد کے ساتھ حیوان بن جاتی ہے تو وہ خود بھی پریشان ہوتی ہے۔

پریم چند کے ناولوں میں عورت کا تصور قدیم ہندو عورت کی اعلیٰ اخلاقی خصوصیات پر مبنی ہے، لیکن اس میں کہیں کہیں مغربی تہذیب کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ 'گودان' میں گووندی اور 'بیوہ' میں پریما جیسے کردار عورت کے اعلیٰ کردار کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ وہ خواتین ہیں جو ہندو درمیانے طبقے کے خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں اور اپنے فرائض سے واقف ہیں، چاہے وہ بیٹی ہو، بیوی ہو یا ماں۔ پریم چند دیہی خواتین کو خود مختار اور خود دار بنانا چاہتے تھے، اور اس کا عکس ان کی تحریروں میں بھی ملتا ہے۔

نذیر احمد، سرشار، ہادی رسوا اور پریم چند کے ناولوں کا سماجی تجزیہ ظاہر کرتا ہے کہ فکری لحاظ سے پریم چند کی تخلیقات حقیقت کے زیادہ قریب ہیں۔ انہوں نے ہندو معاشرے میں عورت کی حالت اور اس کے مسائل کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ آزادی سے پہلے اردو ادب میں خواتین کے موضوع پر جو ناول لکھے گئے، ان میں سماجی مسائل اور خواتین کے مسائل کو کافی جگہ دی گئی۔ پریم چند کے زمانے میں بچپن کی شادی، ستی کی رسم، جہیز کی رسم، طلاق، بیوگی، اور ناخواندگی جیسے مسائل نے ہندوستانی معاشرے کو جکڑ رکھا تھا۔ پریم چند ان سے خواتین کو نجات دلانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ معاشرے کو اس کی ذمہ داری کا احساس بھی دلاتے ہیں، تاکہ عورت اپنے حقوق کا تحفظ کر سکے۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اردو ناول کے ابتدائی مرحلے میں خواتین کو صرف دیوی یا ناز و نخرے دکھانے والی عورت کے طور پر پیش نہیں کیا گیا، بلکہ ان کے اہم کرداروں پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ نذیر احمد اور سرشار نے عورت کی خاندانی مسائل، سماجی تربیت، تعلیم، توہم پرستی، اور پردہ جیسے سماجی مسائل کو ناولوں میں نمایاں طور پر جگہ دی۔ یہ تمام موضوعات صرف زیر بحث نہیں آئے، بلکہ کہیں کہیں ان کا حل بھی پیش کیا گیا۔ رسوا کے ناولوں میں عورت طوائف کے روپ میں سامنے آتی ہے، اور اس شکل سے معاشرہ منہ نہیں موڑ سکتا۔ رسوا نے اس جانب سماجی مفکرین کی توجہ مبذول کرائی۔ پریم چند نے ہندوستانی زمین پر دکھ سہتی عورت کے مسائل اور اس کی ذہنی الجھنوں کو اپنا موضوع بنایا۔ پریم چند کے ناولوں میں سماجی مسائل پر پہلی بار عورت اپنی آواز بلند کرتی نظر آتی ہے۔ پریم چند کی اس کوشش کے ساتھ ہی اردو میں حقیقت نگاری کا دور شروع ہوا، اور نسوانیت کے موضوع کو اردو ناول میں ایک اہم مقام حاصل ہوا۔

حوالہ جات:

1. فہمیدہ کبیر، 'اردو ناول میں عورت کا تسبّتور'، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1992
2. جملی جالبی، 'تاریخِ عدل اُردو'، مجلسِ ترقی ادب، 1984
3. ملا وجہی، 'سب رس'، لاہور اکیڈمی، 1964
4. احمد ڈپٹی نذیر، 'توبتُ النُصُوح'، اردو پبلک لائبریری، آئی. سی. بی. این. 021-203-416-666

5. احمد ڈپٹی نذیر، 'مراتُال عروس'، اردو پبلک لائبریری، آئی. سی. بی. این. 020-203-416-666

6. اولڈن برگ بینا تلوار، 'دی میکنگ آف کالونیل لکھنؤ'، پرنسٹن یونیورسٹی پریس، 1984

7. پریم چند منشی، 'بیبا'، اسٹار بک انٹر نیشنل، لندن، 1990
8. پریم چند منشی، 'گودان'، روپہ اینڈ کمپنی، 2006
9. روسوا مرزا ہادی، 'امراو جان ادا'، سنگمیل پبلی کیشن، 2007
10. سرشار رتن ناتھ دھر، 'فسانہِ آزاد اور سیرِ کوہسار'، نیشنل بک ٹرسٹ، 2001
11. مکھر جی میناکشی، 'ریالزم اینڈ ریلٹی: دی ناول اینڈ سوسائٹی ان انڈیا'، آکسفورڈ پریس, 1985

☆☆☆